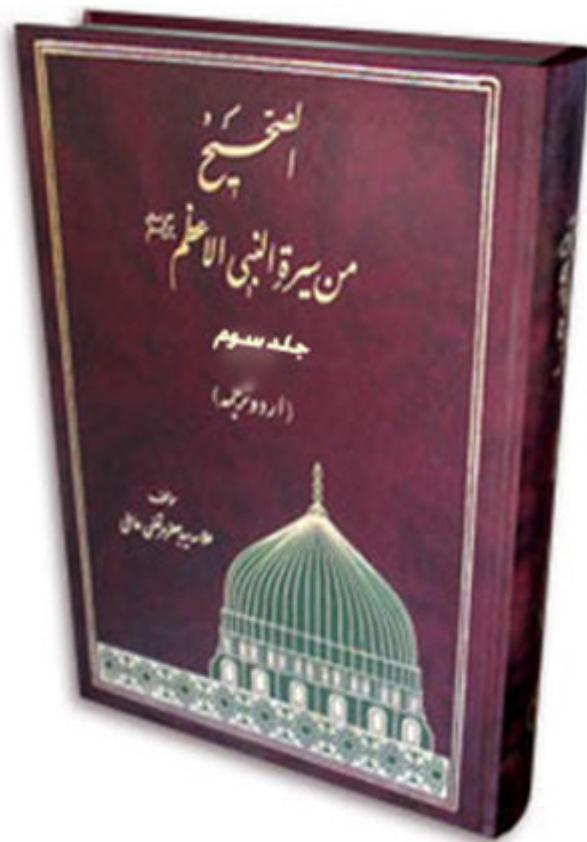


کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟

<"xml encoding="UTF-8?>



اسلام میں جہاد کی اہمیت

اسلام اور تلوار

اسلام دشمن عیسائی مشنری اس بات کو بڑی اہمیت اور اہتمام کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ اسلام تلوار اور طاقت کا دین ہے۔

یہاں تک کہ بعض کتابوں میں انہوں نے ایسے کارٹون بنائے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلواریے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے سروں پر کھڑے ہیں اور یہ عبارت تحریر ہے

"قرآن پر ایمان لے آؤ ورنہ تلوار سے تمہاری گردنیں اڑا دوں گا" پس دشمن گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو اسلام "ادع الی سبیل ربک بالحكمة والموعظة الحسنة"

(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظہ حسنة سے دعوت دو۔ (النحل: ۱۲۵))

کا دعویدار ہے وہ اپنے اس دعوے میں سچا نہیں ہے بلکہ وہ عملی طور پر تلوار سے اپنی تبلیغ کا دعویدار ہے۔

اس نظریئی تقویت میں خود مسلمانوں کی اس مقولے میں طبعی شک و تردید نے بھی مدد کی ہے کہ "اسلام حضرت خدیجہ علیہ السلام کے مال اور حضرت علی علیہ السلام کی تلوار سے پھیلا"

(مفکر اسلام شہید مطہری کا مقالہ مجلہ "جمهوری اسلامی" میں (۱۴ جمادی الثانی ۱۴۱۰ھ شمارہ ۲۶۱) ۔

مسلمانوں نے اس جملے کے الفاظ پر تو توجہ کی لیکن اس کے مفہوم پر گھری دقت نہیں کی۔ ... بلکہ ایسا ہوا کہ بعض قدیم مورخین اور قصہ نویس حضرات نے بھی اس مفہوم کو اسلام سے خارج کرنے میں مدد کی۔ کتاب "فتح الشام للواقدی" سے یہ مطلب بڑی حد تک واضح ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کا شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جو اس طرح کے محیر العقول اور خارق العادہ کارناموں اور تباہ کن واقعات سے خالی ہو۔

یہ سب کچھ بعض پس پرده اہداف کی خاطر تھا تا کہ عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے ساتھ ساتھ امویوں کی قدرت اور عظمت بیان کی جائے اموی حکومت کے منظور نظر افراد کے لئے خیالی بہادریاں ثابت کی جائیں اور اس ذریعہ سے حضرت علی علیہ السلام کے موقف اور کارناموں کو لوگوں کی نظرؤں سے گرا دیا جائے۔ اس کے علاوہ اور بھی مقاصد تھے جن کے متعلق گفتگو کی گنجائشی یہاں نہیں ہے۔ ان بڑے بڑے سفید جھوٹوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام ایک تباہ کن طوفانی موج (سونامی کی لمبیوں) اور قتل و غارت کا دین دکھائی دینے گا۔

یہاں تک کہ خود اکثر مسلمانوں کے لئے بھی یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہوگیا جس کا جواب دینے کے لئے انہوں نے دائیں بائیں جانا شروع کر دیا۔ ان مسلمانوں نے جواباً جو مناسب سمجھا اور جس راستے کو اپنی خواہشات کے مطابق دیکھا اختیار کر لیا۔

اگر چہ یہ بات تاریخ سے مربوط ہے اور یہاں اس گفتگو کو طول دینے سے خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا ہم اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے لئے سر رائے چند نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱: اسلام اور دیگر ادیان میں جنگ کے خد و خال

جنگ بدر سے پہلے کے سرایا اور غزوات کی فصل میں اپنی افواج کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحتوں کا مختصر ذکر ہوگا۔ انہیں دقت سے پڑھنے اور ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید مطالعہ کے خواہش مند حضرات بخار الانوار اور کافی کے علاوہ حدیث اور تاریخ کی دیگر کتابوں کا بھی مطالعہ فرمائیں۔

ساتھ ہی کتب حدیث اور تاریخ کا دقت سے مطالعہ کرتے وقت جنگی قیدیوں کے ساتھ مسلمانوں کے مثالی سلوک سے آگاہی بھی ضروری ہے۔ ہم بھی جنگ بدر کی بحث میں انشاء اللہ اس موضوع پر روشنی ڈالیں گے۔ اسی طرح علامہ احمدی نے بھی اپنی کتاب "الا سیر فی الاسلام" میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں مندرجہ ذیل مطالب ملاحظہ فرمائیں۔

الف: انجیل میں لکھا ہے "یہ گمان بھی نہیں کرو کہ میں زمین پر امن پھیلانے آیا ہوں، میں زمین پر سلامتی پھیلانے نہیں بلکہ تلوار کے ساتھ جنگ کے لئے آیا ہوں"

(انجیل متی اصلاح (سورت) ۲۰ سطر ۳۴) ۔

باء : تورات میں یوں تحریر کیا گیا ہے "جب تم جنگ کے لئے شہر کے قریب جاؤ گے تو وہاں کے لوگوں سے صلح کی استدعا کرو۔ اگر انہوں نے مثبت جواب دیا تو وہ تیرتے لئے فتح ہو جائے گا۔ پس وہاں موجود تمام افراد تیرتے غلام ہوں گے۔ لیکن اگر انہوں نے صلح نہ کی اور جنگ ہی کی تو شہر کا محاصرہ کر لو اور جب تیرا رب، تیرا معبود تجھے فتح دے دے تو تمام مردوں کی گردنیں تلوار سے اڑا دے۔ لیکن خواتین، بچے اور حیوانات اور جو کچھ شہر میں ہے یہ سب کچھ مال غنیمت ہے جو صرف تیرتے لئے ہے۔ دشمنوں کا مال غنیمت جو تیرتے رب اور معبود نے تجھے عطا کیا ہے کھالی، استعمال کر۔ وہ تمام علاقے جو تجھ سے بہت دور ہیں اور یہ علاقے ان اقوام کے نہیں ہیں، ان میں بھی یہی اعمال انجام دے۔ لیکن وہ علاقے جو یہاں کی اقوام کے ہیں اور تیرتے رب اور تیرتے معبود نے تجھے عنایت کیے ہیں وہاں کا کوئی ذی روح بھی زندہ نہیں رہنا چاہئے"

(سفر تثنیہ "اصحاح" ۲۰ سطر ۱۷ - ۱۷)

جیم: تورات ہی میں لکھا ہے "شہر والوں کو تلوار سے اڑا کے رکھ دو۔ شہر کو اس میں موجود تمام چیزوں سمیت جلا دو۔ اسکے ساتھ حیوانات وغیرہ جو کچھ بھی ہے سب کو تلوار سے نابود کر دو۔" تما م اشیاء کو اکٹھا کرو اور شہر کے چوک میں جمع کر کے انہیں شہر سمیت آگ لگادو۔ اس سے وہ شہر اب تک راکھ کا ٹیلہ بن جائے گا

(سفر تثنیہ "اصحاح" ۱۳ سطر ۱۵)

یہاں مزید دستاویزات بھی ہیں جن کی تحقیق کا موقع و محل نہیں

(سفر تثنیہ الاصحاح ۷، سطرا ۲، سفر سموئیل اول الاصحاح ۱۵، عبرانیوں کو پولس کا خط الاصحاح ۱۱ سطر ۳۲ اور اسکے بعد، انیس الاعلام ج/۵ ص ۳۰۲ و ۳۱۶ اور دیگر کتب)

ایک اشارہ

امویوں اور عباسیوں وغیرہ کے کرتو تو نیز جنگوں اور ذاتی دشمنیوں میں ان کے مظالم اور قتل و غارتگری کی وجہ سے ہونے والی اسلام کی بربادی اسلام کی پیچان نہیں بلکہ اسلام پر ہونے والا ظلم، زیادتی اور خیانت ہے۔ کیونکہ اسلام اپنے سے منحرفین کی بدکرداری کا ضامن نہیں ہے اس لئے کہ اسلام اور چیز ہے اور منحرفین کا کردار اور چیز ہے۔

۲ : جب جنگ ناگزیر ہو

اگر ہم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کریم کی مشرکوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں کا مطالعہ کرنا چاہیں تو انہیں مندرجہ ذیل نکات میں خلاصہ کر سکتے ہیں:

الف : وراثت وغیرہ جیسے عوامل سے قطع نظر انسان کی شخصیت؛

اسکی خصوصیات، عادات، صفات اور مختلف نفسیاتی، روحانی، فکری، جذباتی اور دیگر پہلو عام طور پر اس ماحول کے زیر اثر ہوتے ہیں جہاں انسان رہتا ہے۔ وہ والدین، استاد اور دوست وغیرہ سے افکار اور دینی مفابیم و اقدار حاصل کرتا ہے۔

پس وہ شخص ذلیل و بزدل ہوگا جس کی تربیت کرنے والوں نے خوف اور دہشت کا رویہ اختیار کیا ہو اور وہ شخص شجاع اور جنگجو ہوگا جسکی تربیت کرنے والوں نے خوف کے برخلاف حوصلہ افزائی کی روشن اختیار کی ہے (یعنی خوف، دھمکیوں اور دہشت کے سائے میں پلنے والا بچہ خود اعتمادی کے فقدان سے بزدل اور ذلت پسند ہوگا۔ لیکن محبت اور شفقت کے سائے میں پلنے والا بچہ خود اعتمادی کے وجود سے بہادر اور سوشنل ہوگا۔ البتہ لاد اور ناز کے سائے میں پلنے والا بچہ خود پسند اور مغرور ہوگا)۔

اسی طرح وہ بچہ جسے بچپن میں بہت زیادہ توجہ اور شفقت ملی ہو اس کی پرورش بالکل مختلف ہوگی اور جو ظلم و قساوت کو دیکھے گا تو اس کا رد عمل بہت مختلف ہوگا۔ چاہے ان دو بچوں نے ایک ہی گھر میں پرورش پائی ہو اور وہ دونوں حقیقی جڑوں بھائی ہوں۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ ذہنی تصورات جنہیں انسان حواس کے ذریعے حاصل کرتا ہے اور انہیں اپنے علم و ادراک کا اہم منبع قرار دیتا ہے وہ بھی دوسروں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اگر ہم دو ایسے جڑوں بچوں کو فرض کر لیں جو اکٹھے رہتے ہوں ان کے حالات بھی ایک جیسے ہوں اور یہ بھی فرض کر لیں کہ تعلیم و تربیت، وسائل اور حالات زندگی وغیرہ تک بھی یکساں ہوں تو اسکے باوجود بھی ہم دیکھیں گے کہ ان دونوں کے افکار، نفسیات اور احساسات وغیرہ ایک دوسرے سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ اسکی وجہ وہ ذہنی تصورات ہیں جو دونوں نے اخذ کیے ہیں اور جن سے ان کے تفکر کی تشكیل ہوئی اور ان دونوں کا ان خیالات پر رد عمل مختلف تھا۔ جی ہاں چاہے وہ دونوں ایک ہی کمرٹ میں بیٹھے ہوں، ایک ہی راستے پر چل رہے ہوں اور ایک ہی سکول اور مدرسے میں پڑھ رہے ہوں پھر بھی دونوں کا ذہن ایک ہی خیال کے متعلق مختلف رد عمل ظاہر کرے گا چاہے وہ اختلاف جزوی ہی ہو۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہر ایک کانقطرے نظر مختلف ہے۔ یہی صورت حال آوازوں، اور خوشبوؤں وغیرہ کے بارے میں ہے۔ یہ صورت اسکے ہاں اپنا ایک خاص مقام اور ایک خاص اثر رکھتی ہے، اس کے فکری خطوط کو بھی بدل دیتی ہے۔ کبھی تو ان خطوط کو آگے بڑھاتی ہے اور کبھی اس کے آگے بند با ندھہ دیتی ہے۔

تصورات کا اختلاف ان کے ذہنوں میں مختلف نتائج کو جنم دیتا ہے۔ اسی طرح یہ تصورات روح، آداب اور احساسات پر مختلف اثرات مرتب کرتے ہیں۔

ان باتوں سے ہمیں پتہ چل سکتا ہے کہ لوگ آداب، افکار اور اخلاقیات وغیرہ کے لحاظ سے ایک دوسرے پر کتنے اثر انداز ہوتے ہیں۔ آپ خود اگر کسی بدمزاج، غصیلے اور ترش رو دوکاندار کے پاس کھڑے ہوں اور پھر کسی ایسے مہذب دوکاندار کے پاس کھڑے ہو جو مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملے اور بہت اچھے اور میٹھے لہجے کے ساتھ آپ سے گفتگو کرے تو آپ یقیناً اپنے رگ و پے میں ان دونوں کا فرق محسوس کریں گے۔ اس سارے عمل کا اثر بچوں اور دوستوں وغیرہ کے ساتھ آپ کے تعلقات پر یقیناً مرتب ہوگا۔

پس جب ایک فکر اتنی اہمیت کی حامل اور حساس ہے کہ اس سے انسانی عقیدہ تشكیل پاتا ہے اور انسان اس سے متاثر ہوتا ہے تو یقیناً کسی معاشرے میں پیدا ہونے والا انحراف چاہے وہ محدود پیمانے پر ہی ہو وہ صرف انحراف کے مرتكب ہونے والے تک محدود نہیں رہے گا بلکہ چاہے تھوڑی مقدار اور محدود پیمانے پر ہی سہی وہ اس کے ساتھ رہنے والوں اور اس کے دور یا نزدیک کے تعلق داروں پر بھی اثر انداز ہوگا پھر ان سے دوسروں میں

(اور انحراف کے مرتکب فرد کا حلقہ شناسائی اور دائیرہ اثر جتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہوگا انحراف بھی اتنے وسیع پیمانے پر اور تیزی سے پھیلے گا۔ مترجم)

یہی سبب ہے کہ اسلام برائی سے پوری طاقت کے ساتھ اور علانیہ نبرد آزما ہوتا ہے۔ اسلام نے تو چھپ چھپ کر گناہ والی کی غیبت سے بھی منع کیا ہے تا کہ لوگ کسی بھی برائی یا انحراف کی خبر سننے کی عادت نہ اپنا لیں کیونکہ اس سے ان کے ذہن برائی سے مانوس ہو جائیں گے پھر ان کے لئے برائی کا ارتکاب آسان ہو جائے گا اور وہ اس کی عادت بنالیں گے۔ اسلام تو اتنا بھی نہیں چاہتا کہ ان کے ذہنوں میں برائی کے تصور کا بھی گزر ہو چہ جائیکہ وہ شخص خود اس برائی کی عادت اپنالی کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ لوگ برائیوں سے دور رہیں لیکن اس کے اثر سے لوگ برائیوں کے مرتکب ہوں گے۔ آپ ذرا برائیوں اور نقصان دہ امور پر لفظ "المنکر" کے اطلاق پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اسلام چاہتا ہے کہ لوگ ان باتوں سے دور اور لاعلم رہیں۔ اسی طرح جہاں اسلام چھپ چھپ کر گناہ کرنے والی کی غیبت سے منع کرتا ہے تو وہ یہ چاہتا ہے کہ گناہگار انسان کو ایک فرصت مہیا کی جائے تا کہ وہ اپنے گناہوں سے چھٹکارا حاصل کر سکے نیز اس کی شخصیت کی تعمیر و ترقی کے لئے اسے ایک مناسب معاشرتی فضا مہیا کرے نیز اس کی عزت و شرافت و غیرہ کی حفاظت کرے اس کے علاوہ اور بھی مقاصد ہیں جن کے بیان کا مقام یہاں نہیں ہے۔

پس اگر انحراف اور کجی کا نقصان اسکے ارتکاب کرنے والے تک محدود نہ رہے اور وہ دوسروں تک سرایت کر جائے تو پھر دوسروں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود کو اس نقصان سے محفوظ کریں۔ اگر شریعت کی بات نہ بھی ہو تو بھی عقل و فطرت کا یہی حکم ہے۔ البتہ شریعت، ذات کے اس حق دفاع کے اعتراف پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ امر بالمعروف اور نہیں عن المنکر کے وجوب کے ذریعہ اس دفاع کو پر فرد پر واجب اور فرض قرار دیتی ہے تا کہ ایک تو یہ لوگ اپنی حفاظت کریں اور دوسرا اس انحراف اور برائی سے دوسروں کو بچائیں

(برائی کے انجام دینے والے کو دو عذاب (ایک برائی کے انجام دینے پر اور دوسرا عذاب دوسروں کو مبتلا کرنے پر) نہیں ہوں گے بلکہ اس شخص کے لئے صرف ایک ہی عذاب ہے، وہ اس لئے کہ اس نے (برائی نہ کرنے پر) دوسروں کے اختیار کو سلب نہیں کیا اور نہ ہی اسکا یہ ارادہ تھا۔ البتہ اسکے فعل نے دوسروں کے لئے برائی انجام دینے کی راہ ہموار کی اور یہ امر دوسروں کی برائی کا مسبب نہیں۔ ارتکاب گناہ میں ارادہ اور نیت نیز عذاب کے استحقاق یا عدم استحقاق کے عنصر کو مد نظر رکھتے ہوئے بماری بات اور مندرجہ ذیل معروف حدیث کے درمیان فرق واضح ہو جائے گا۔ معروف حدیث یہ ہے: "جس کسی نے ایک نیک عمل کی بنیاد رکھی اس کو اسکا اجر اور قیامت تک پر اس شخص کے عمل کا اجر ملے گا جو اس پر عمل کرتا رہے گا اور جس کسی نے ایک بڑے عمل کی بنیاد رکھی تو اس کو اپنے عمل کا گناہ اور قیامت تک پر اس شخص کے عمل کا گناہ بھی ملے گا جو یہ برائی انجام دے گا۔"

گذشتہ تمام گفتگو کی روشنی میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کریم کے اس فرمان کا راز بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں

سب مؤمن ایک جسم کی مانند ہیں کہ جب بھی جسم کے کسی حصے میں تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی و پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔

پس اس بنا پر برائی سے روکنے اور نیکی کا حکم دینے والے کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تجھے کیا؟ تجھے اس سے کوئی مطلب؟

یا میں آزاد ہوں یا اس طرح کے جملے۔ کیونکہ یہ امر بالمعروف ہی ہے جو در حقیقت آپ کی حفاظت کرتا ہے۔ اور ہر کسی کی آزادی اتنی ہے کہ وہ دوسروں پر کسی قسم کی بھی زیادتی نہ کرے اور نہ ہی اس کی آزادی کو کوئی نقصان ہو۔ اور انحراف تو زیادتی کی خطرناک ترین اور ناپسندیدہ ترین صورت ہے۔

یہ بڑی واضح سی بات ہے کہ انحراف کے خطرے کو دور کرنے اور برائی کے خاتمے کی خاطر مختلف مدارج اور مراحل کا خیال رکھا جانا چاہئے۔ جیسے آپکا بیٹا اگر کسی برائی یا غلطی کا مرتکب ہوتا ہے تو پہلے مرحلے میں آپ اسے منع کریں گے، پھر اسے سمجھائیں گے، پھر ڈرائیڈھمکائیں گے، پھر ماریں پیٹیں گے اور پھر خود سے دور کریں گے۔ اسی طرح شدت اختیار کرتے جائیں گے۔ یہ سب مراحل و مدارج شرعی، عقلی اور فطری ہیں۔ انسان کا کوئی ایک عضو اگر بیماری میں مبتلا ہو جائے تو پہلا مرحلہ دوائیوں سے علاج ہے۔

اگر پھر بھی ٹھیک نہ ہو تو جراحی "operation" کا مرحلہ آتا ہے۔ اور اگر اس کے باوجود مرض اتنی خطرناک صورت اختیار کر جائے اور زخم ناسور بن جائے کہ وہ عضو نہ صرف پورے جسم پر بے فائدہ بوجہ بن جائے بلکہ اس کا درد اور اس کی بیماری دوسرے اعضاء میں سراحت کرنے لگے اور انہیں صحیح طریقے سے کام نہ کرنے دے تو اس صورت میں اگر طبیب اس حصے کو علیحدہ نہیں کرے گا تو خود انسان کے تلف ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اس مرحلے میں بدن کے اس حصے کو کاٹنے کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ نہ کاٹنے کی صورت میں وہ طبیب اس بیمار سے خیانت کا مرتکب ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ اسلام، عقل اور فطرت نے مسلمانوں کو ایک جسم کی طرح قرار دیا ہے۔ جب ایک عضو میں درد ہو تو سارا بدن درد و اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ بات صرف مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں بلکہ تمام بنی آدم کے ساتھ ایسا ہی ہے۔

پس جو شخص عقیدہ و اخلاق اور آداب و کردار کے لحاظ سے منحرف ہو جائے تو ضروری ہے کہ سب سے پہلے حکمت، پیار اور موعظہ حسنہ سے اسکی اصلاح کی جائے پھر ڈرایا دھمکایا جائے اسکے بعد سختی اور شدت کا استعمال کیا جائے۔ اگر یہ سارے ذرائع اور سائل کامیاب نہ ہوں تو پھر اس کا آخری علاج اسے قرنطینہ کرنا ہے اور اگر بیماری انتہائی خطرناک اور ناسور ہو جائے تو پھر (نہ صرف اس شخص کو قرنطینہ کرنا چاہئے بلکہ) ضروری ہو جاتا ہے کہ اس بیماری کو ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس صورت میں عضو فاسد کو نہ کاٹنا پوری امت بلکہ نسلوں اور انسانیت کے ساتھ خیانت ہوگی۔ بلکہ دینی اور عقیدتی انحراف کا خطرہ تو جسمی اور بدنی امراض سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ جسمانی امراض کا دائیہ نسبتاً محدود ہے لیکن دینی، عقیدتی، فکری اور اخلاقی انحراف سے جسم، مال و اموال، مقام، انسان، اخلاقی اقدار، انسانیت بلکہ سارا معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے جس کے اثرات آنے والی نسلوں پر بھی پڑتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس منحرف شخص کو جرم اور گناہ انجام دینے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی اور وہ بڑھ سے بڑا جرم و گناہ انجام دیتا چلا جاتا ہے۔ جب اس انسان کی کسوٹی اور معیار، فقط اور فقط اسکے ذاتی مفادات ہوں، تب وہ شخص کسی اور چیز کو اہمیت نہیں دیتا، اللہ کی خوشنودی کو اہم نہیں سمجھتا، امت کی اجتماعی مصلحتوں کو مدنظر نہیں رکھتا، شریعت اور دین کے احکام کو غیر اہم سمجھتا ہے اور عقل و منطق کو کوئی حیثیت نہیں دیتا۔

اسی لئے جہاد در حقیقت اس انحراف کو روکنے کا ایک ذریعہ ہونے کی وجہ سے دین اور شریعت سے بڑھ کر عقل اور فطرت کے احکام میں سے ایک حکم ہے۔

گزشتہ بحث کی روشنی میں ہم نہایت جرأت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام، جہاد کے لئے تلوار استعمال نہ کرتا تو وہ حق اور عدل نیز فطرت اور عقل کا دین ہی نہ ہوتا۔ اس طرح نہ صرف معاشرے بلکہ اب تک کے لئے تمام انسانیت کا خائن ہوتا۔ ہم جانتے ہیں کہ فکر، عقل اور قوت مدافعت پر مبنی سیاست ہی عدل قائم کرنے والے اور ظلم کو مٹانے والے دین، اسلام کا اصل اصول ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رَسُولًاٰ بِالْبَيِّنَاتِ وَإِنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُولُ النَّاسُ بِالْقُسْطِ وَإِنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَاسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعٌ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مِنْ يُنْصَرُهُ وَرَسْلُهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ) (حدید/ ۲۵)

بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تا کہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں اور ہم نے لوہے کو بھی نازل کیا ہے جس میں شدید سختی اور لوگوں کے لئے بہت سے دوسرے فوائد بھی ہیں یہ سب اس لئے ہے کہ خدا یہ دیکھے کہ کون بغیر دیکھے اسکی اور اسکے رسول کی مدد کرتا ہے اور یقیناً اللہ بڑا صاحب قوت اور صاحب عزت ہے۔

اگر دین خیانت کو اپنی عادت اور اصول قرار دیتا، انسانی نسلوں کی مصلحتوں سے تجاذب بر تنا اور اس کے احکام میں یہ بہت بڑے نقصائص ہوتے تو اس کے قوانین کی انسانوں اور انسانی سماج کو قطعاً ضرورت نہ ہوتی۔ پھر تو اسکی راہ میں قربانی دینے بلکہ اس کی حفاظت کرنے اور دین کی عظمت اور سر بلندی کی خاطر کسی بھی کام کا کوئی معنی اور فائدہ نہ رہتا۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ کیوں جہاد کو جنت کے دروازوں میں سے ایک ایسا دروازہ قرار دیا گیا ہے جسے اللہ نے اپنے خاص اولیاء کے لئے کھول رکھا ہے۔ یہ تقویٰ کا لباس، اللہ تعالیٰ کی مضبوط زرہ اور قابل اعتماد ڈھال ہے

(ملاحظہ ہو: نهج البلاغہ شرح محمد عبدہ خطبہ جہاد ج ۱ ص ۶۳)۔

یہ سب تونظیریاتی لحاظ سے ہے۔ البتہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے تاریخی حقائق کیا تھے جہاد کے متعلق گفتگو کے دوران اس کی طرف اشارہ کریں گے۔

باء: اہل مکہ کے مقابلے میں اپنا دفاع کرنا ہر مسلمان کا حق تھا کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کو ان کے دین سے بہتانے کے لئے سازشیں کیں اور اللہ کے راستے میں رکاوٹیں ڈالیں۔ اس لئے ان سب کا حق بنتا تھا کہ وہ عقیدہ، بیان، فکر اور دعوت الی اللہ کی آزادی کے حصول کے لئے اہل مکہ کے خلاف جنگ کرتے یہ جنگ خصوصاً اس وقت ضروری ہو جاتی ہے جب دشمن تشدد کے استعمال پر اصرار کرتے اور اس کے نیز اس کے عقائد کے سامنے منطق اور دلیل کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ پس اسلام یہ نہیں چاہتا کہ کوئی جبراً اس کو قبول کرے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ سب کو عقیدے، فکر، اور موقف میں آزادی حاصل ہو۔

اس لئے اسلام نے جو علاقوں فتح کئے وہاں کے لوگوں کو بعض معاملات میں اختیار دیا۔ ان میں سے ایک "قبول اسلام" بھی تھا۔ جو کوئی اسلام قبول کرتا وہ پوری رغبت و شوق، آزادی اور ارادت کے ساتھ نیزمسلمانوں کی طرف سے کسی رسمی سے دباؤ کے بھی بغیر قبول کرتا۔ بہت سارے علاقوں میں تو اسلامی فتح کا انتظار بھی نہ کیا

گیا۔ فقط اسلام کی اطلاع پر ہی لوگ اسلام کے سامنے جھک گئے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام اور مسلمان اپنے خلاف ہر طرح کی سختی، زیادتی اور مسلسل ظلم کے سامنے ہاتھ باندھے رکھیں کہ ظالم ان کا خون چوستے رہیں۔ یا ان لوگوں کے ہر دباؤ اور فیصلوں کے سامنے جھک جائیں جو براحت میں انکے خلاف ہیں۔ نیز اس آزادی کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ایسی تیاری بھی بالکل نہیں کرنی چاہئے کہ جس سے وہ اللہ اور اپنے دشمن کو خوف زدہ کر سکیں۔ جس اسلام کی طرف مسلمان دعوت دیتے ہیں اور آزادی فکر و نظر سے اسے قبول کرنے کے خواہاں ہیں وہ فقط ایک انفرادی مذہبی اعمال یا تزکیہ نفس جیسے اعمال ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اسلام ایک ایسا عمومی نظام ہے جو عالمی سطح پر یکسر تبدیلیوں کی قیادت کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ اور ایک ایسا نظام ہے جس میں سب انسانوں کے حقوق محفوظ ہوں۔ یہی وہ بات ہے جس نے اسلام کی وسیع سطح پر حمایت کو یقینی بنایا ہے۔ کیونکہ اسلام کو ان جابر و ظالم اور لالچی افراد سے ٹکر لینی ہے جو اپنی نفسانی خواہشات اور رجحانات کے مطابق لوگوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں جب رائے، فکر اور عقیدہ کی آزادی کا حصول صرف طاقت کے استعمال سے ہی ممکن ہو تو پھر سختی اور شدت استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ معاشرے میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے ایک مناسب فضا مہیا کی جائے نیز حقیقی اسلام، ان حکمرانوں کے اسلام میں تبدیل نہ ہو جائے جو اسلام کو اپنی خواہشات اور مفادات کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ بعض فرقوں اور مذاہب کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور وہ اس شدید بیماری میں مبتلا ہو گئے، نیز اسلامی قانون سازی کا محور کوئی بڑی اور سرکردہ شخصیت بھی نہ بننے پائے ورنہ اسلام ایک مردھ کی فکر ہو گی جو صرف عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہو گی جس کا تعلق معاشرتی زندگی سے قطعاً نہیں ہوگا۔

(مصنف کا اشارہ شاید کیمونزم کی جانب ہے جس کے متعلق خمینی بت شکن (رح) نے گورباچف کے نام اپنے خط میں پیشین گوئی کر دی تھی کہ (دوسرے باطل عقائد مذاہب کی طرح) یہ بھی تاریخ کے میوزیم میں منتقل ہو جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی اب صرف چند مردہ پرست ہی اس دنیا میں رہ گئے ہیں جو اسے زندہ رکھنے کی نام کوششوں میں مصروف ہیں۔ مترجم)۔

اگر رائے، فکر اور عقیدہ کی آزادی ہو تو یہ بات دوسرویکے حوصلے کا سبب بنے گی کہ وہ لوگ بھی دائیرہ اسلام میں داخل ہو کر تکلیفوں، اذیتوں، مختلف قسم کے دباؤ اور اس فتنہ کی آگ سے بھی محفوظ رہیں جو اسلام کی نظر میں قتل سے زیادہ خطرناک ہے۔ پس مسلمان جب جنگ کرتے ہیں تو وہ اپنے ان حقوق کے دفاع کے لئے جنگ لڑتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے قرار دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث بھی ہیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔ نیز قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

(اذن للذين يقاتلون بهم ظلموا و ان الله على نصرهم لقدر الذين اخرجوا من ديارهم بغير حق الا ان يقولوا ربنا الله) (الحج ٤٠، ٣٩)

جن لوگوں سے مسلسل جنگ کی جاری ہے انہیں ان کی مظلومیت کی بنا پر (جنگ کی) اجازت دی گئی ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے نا حق نکال دیئے گئے ہیں ان کا

قصور صرف یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں اللہ ہمارا پروردگار ہے۔

پس مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس صورت میں ملی کہ دوسروں نے ان پر جنگ مسلط کر دی تھی اور انہیں اپنے گھروں سے بھی نکال باہر کیا تھا لیکن اگر ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے جن میں غزوت کا ذکر ہے تو قاری کے ذہن میں یہ تصور ابھرتا ہے کہ اسلام تو قتل و نابودی کا مذہب ہے۔ آپ واقعی کی "فتح الشام" کی طرف رجوع کر کے دیکھیں۔ یہ سب کچھ غالباً اس لئے ہے کہ اس میں بنی امیہ کی شان و شوکت اور اقتدار و غلبے کا ذکر ہے۔ بعض محققین نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے (آیت اللہ سید مهدی الحسینی الروحانی۔)

جیم: گزشتہ گفتگو کی روشنی میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کی سیرت اور عادت یہ تھی کہ وہ دشمنوں کے سامنے نہایت منصفانہ انتخاب رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ان پیشکشوں کے بعد بعض مشرکین یہ اقرار کرتے تھے کہ اس پیشکش کے بعد اب جنگ پر اصرار ظلم و زیادتی کے علاوہ اور کچھ نہیں لیکن سریہ ابن حجش میں ابن حضرمی کے قتل کے بعد باقی مشرکوں نے ان پیشکشوں کو ٹھکرانا شروع کر دیا تھا کیونکہ وہ مسلمانوں سے جنگ کا پختہ ارادہ کرچکے تھے (تاریخ طبری ج/ ۲ ص ۱۳۱ کامل ابن اثیر ج/ ۲ ص ۱۱۶)۔

حالانکہ وہ ابن حضرمی کے قتل کا بدلہ دو طرح سے لے سکتے تھے۔ ایک یہ کہ محدود پیمانے پر اس کا بدلہ لیا جاتا دوسرا یہ کہ دیت قبول کر لی جاتی حالانکہ یہ دونوں عمل عربوں کے رسم و رواج کا حصہ تھے اور ان کی اخلاقیات کے لحاظ سے بعید بھی نہیں تھے۔

دال: معابدے توڑتے والوں کے خلاف قیام کرنا اور انہیں اپنی حدود میں رکھنا کیونکہ یہودی معابدے توڑتے تھے اور پھر کفار و مشرکین مکہ بھی وہ لوگ تھے جو صلح حدیبیہ کا معابدہ توڑ چکے تھے۔

ہائی: جنگ کے شعلے بھڑکانے والوں اور زیادتی کرنے والوں کے مقابلے میں اپنا دفاع۔ جن لوگوں نے مدینہ پر لشکر کشی کی اور لوٹ مار مچائی ان کا پیچھا۔

بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ مشرکین مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مسلسل معرکہ آرائی جاری رکھی جبکہ مسلمان صلح حدیبیہ تک ہمیشہ اپنا دفاع کرتے رہے۔ حتیٰ کہ بخاری لکھتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ بنی قریظہ سے پلٹنے کے بعد فرمایا: "اب ہم ان کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں لیکن وہ ہمارے خلاف جنگ نہیں کرسکتے"۔ اس کا ذکر انشاء اللہ آئے گا۔

کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟

گذشتہ مطالب کی روشنی میں ہمارے لئے واضح ہو جاتا ہے کہ "اسلام علی علیہ السلام" کی تلوار سے پھیلا" کے مقولے کا مطلب ہر گزیہ نہیں ہے کہ حضرت علیہ السلام نے لوگوں کے سر پر تلوار رکھ کر فرمایا ہو کہ اسلام لے آؤ یا قتل کے لئے تیار ہو جاؤ۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی تلوار فقط اور فقط اسلام کے دفاع کے لئے اٹھی۔ اس تلوار نے دشمنوں کی زیادتیوں کو روکا اور آزادی رائی، فکر اور عقیدہ کی حفاظت کی اور اسلام کے دفاع میں اپنا گھر اثر چھوڑا۔

اور چونکہ اسلامی جنگوں کا مقصد انسان کی حفاظت، اس کی شخصیت کا تحفظ اور آزادی فکر و عقیدہ و رائے کے لئے فضا ہموار کرنا تھا، اس لئے ان وجوہات کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جنگیں ممکنہ طور پر اتنی مختصر تھیں جن سے فقط مقصد حاصل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی ضبط نفس اور تقوی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ خطرناک ترین حالات اور لحظوں میں بھی ان چیزوں کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ اسی لئے پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دس سالہ مدنی زندگی کے مختصر عرصے میں غزوہات اور سریوں پر مشتمل دسیوں جنگوں میں مؤرخین کے بقول آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار سے مقتولین کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز نہیں کرتی

(ملاحظہ ہو سید ہادی خسرو شاہی کا مضمون "سیماں اسلام")

حالانکہ ان جنگوں سے مشرکین کا مقصد پورے جزیرہ العرب میں اسلامی حکومت کے نفوذ و قدرت کے زیادہ ہونے نیزاسکی حدود کو اس سے کہیں زیادہ پھیلنے سے روکنا تھا بلکہ سرے سے اسلام کا ہی قلع قمع کرنا تھا۔

ہم نے عجلت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے ورنہ جہاد کا موضوع تو بہت زیادہ طول و تفصیل کا طالب ہے۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی آیات، پیامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ ہدی علیہ السلام کی احادیث، انکے جہادی موقف اور کوششوں پر گھری نظر ڈالی جائے۔